رام پور میں اردو شاعری کا منظر نامہ
(۱۸۵۷ء تا ۱۸۹۰ء)

ڈاکٹر لیاقت علی

صدر شعبہ اردو

گورنمنٹ کالج ٹاؤن شپ، لاہور

URDU POETRY IN RAMPUR
FROM 1857 TO 1890

Liaqat Ali, PhD
Chairman Department of Urdu
Govt College, Township, Lahore

Abstract

This paper focuses the poetic environment of Ram Pur State after 1857. It was a crucial time for poets of Delhi and Lucknow. Ram Pur state became a peaceful shelter for them. Nawwab Yousaf Ali Khan Nazim, a pupil of Ghalib, himself was a renowned poet and patern of Urdu literature. So the local and migrated poets were equally honored in the court of Nawwab. Some off springs of Nawwab's family were inclined towards poetry and they also participated in progressing movement of Urdu poetry. The overall poetic literature of Ram Pur was sensual, romantic and pleasant whereas some thoughtful verses were available at times.

Keywords:

رام پور، لکھنؤ، دکن، یوسف علی خاں ناظم، مومن، غالب، حشمت علی خاں، اردو، شاعری

ریاست رام پور میں پروان چڑھنے والی اردو شاعری کے اعتبار سے یہ دور (۱۸۵۷ء تا ۱۸۹۰ء) انتہائی اہم قرار دیا جا سکتا ہے کیوں کہ اس زمانے میں مقامی لوگوں کی انگریزوں کے خلاف بغاوت، تحریکِ آزادی سے زیادہ خانہ جنگی اور بدامنی کا شاخسانہ بن چکی تھی۔ اِن حالات میں نواب یوسف علی خاں ناظم نے دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے نہ صرف باغیوں کے غضب سے ریاست کو محفوظ رکھا بلکہ درپردہ انگریز کمپنی کی معاونت کر کے اُنھیں دوبارہ ملک کا نظامِ حکومت سنبھالنے کے قابل بنایا۔ نواب کی حکمتِ عملی سے ریاست ایک ایسا محفوظ مقام بن گئی جہاں ہندوستان کے مختلف خطوں سے اہلِ علم وادب رام پور کی طرف کھنچے چلے آئے۔ ناظم نے نہ صرف اِن خانماں خراب شعرا کی اعانت کی جو گھر بار چھوڑ کر اُن کی ریاست سے وابستہ ہوئے تھے بلکہ خود بھی اپنے استاد غالبؔ کے رنگ میں شعر کہہ کر شعری ادب میں خوبصورت اضافہ کیا۔ غالب کے شاگردوں میں ناظم واحد شاگرد ہیں جنھوں نے ان کا انداز اپنایا اور اس طرزِ سخن کو رام پور کی شاعری میں مِلا کر دبستانِ رام پور کا حصّہ بنا دیا، تاہم اُن کے ہاں انفرادی رنگِ سخن بھی موجود ہے۔ ناظم کی شاعری کا وہ انداز دیکھیے جس میں غالبؔ کی جھلک دکھائی دیتی ہے:

بیداد سے توبہ اُنھیں کرتے ہی بن آئی　　جب بعد مرے کوئی نہ مجھ سا نظر آیا

غالبؔ کی زمین میں ایک شعر دیکھیے:

وہی تم ہو، وہی خنجر ہے پر انصاف کرو　　ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو کیا میرے بعد

جدّتِ ادا کی ایک مثال اس شعر میں دیکھی جا سکتی ہے کہ جس میں محبوب کے تغافل کا شکوہ بڑے دھیمے لہجے میں کیا گیا ہے:

مل جاتے ہیں تو کہتے ہیں، 'اچھی طرح تو ہو،　　گویا ہمارے جی میں کچھ ارمان ہی نہیں

شبیر علی خاں شکیبؔ کے بقول: ''ناظم کے یہاں مومنؔ کی تراش وخراش، غالبؔ کی شگفتگی .....اور خود ان کی رومانی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔'' (۱)

ناظم غالبؔ کی طرح فرہاد پر طنز بھی کرتے ہیں بلکہ طنز سے آگے تضحیک تک پہنچ جاتے ہیں۔ فرہاد کے بارے میں اُن کا کہنا ہے کہ

فرہادِ ہوس پیشہ نے بھی دی تو سہی جان　　پر شیوۂ اربابِ وفا اور ہی کچھ ہے

جہاں کہیں ناظم کا انفرادی رنگ نمایاں ہے وہاں شاعری کا معیار بھی کسی قدر کم ہو گیا ہے۔ مثلاً

کہے یہ کون کہ تم کیوں وفا نہیں کرتے　　وہ کیا کہیں گے، مگر یہ کہ ''جا نہیں کرتے''

نواب ناظم کے چچیرے بھائی عنایت علی خاں عنایتؔ اور عباس علی خاں بیتابؔ مومنؔ کے شاگرد تھے اور شعر گوئی میں مہارت رکھتے تھے۔

عنایتؔ کہتے ہیں:

مجھ سے آنکھیں مری لے لو کہ یہ کام آئیں گی میں نہ ہوں گا تو بہت آپ کو رونا ہو گا

خاموش جلا کرتے ہیں محفل میں کسی کی یوں شمع کو سکھلاتے ہیں آداب فنا ہم

عنایتؔ کو دل کی واردات کہنے کا ہُنر آتا ہے۔ وہ محبت میں درپیش کیفیات کو سمجھتے ہیں اور ایک عاشق کی بے بسی کا اُنھیں خوب اندازہ ہے جب وہ خود کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

تجھے نہ ہوں تو عنایتؔ یہ ذکّیں ہوں کسے تجھے تو روٹھ بھی رہنا ذرا نہیں آتا

عنایتؔ کے بھائی عباس علی خاں بیتابؔ کو بھی مومنؔ کا رنگِ سخن مرغوب تھا۔ اُن کی غزل کے دو شعر اس طرح ہیں:

ہر بات میں برہم کوئی ایسا نہیں ہوتا آپس میں ذرا سمجھو تو کیا کیا نہیں ہوتا

کچھ بن گئی ہے ایسی ہی دل پر مرے ورنہ مرنا تو کسی کو بھی گوارا نہیں ہوتا

زاہد پہ طنز اردو شاعری کا مرغوب اور مروّجہ مضمون ہے بیتابؔ نے اس میں اپنے خاص اسلوب سے جدّت پیدا کر دی ہے۔ کہتے ہیں:

مل گیا راہ میں بُت خانہ بھلے کو زاہد کعبے کو جا ہی چکے تھے ترے بہکانے سے

عنایتؔ اور بیتابؔ کے بھائی عبدالوہاب خاں سروشؔ اور ہدایت علی خاں غربتؔ بھی شاعر تھے۔ سروش سیدھے اور سادہ سے لفظوں میں بات کہنے کا ہُنر جانتے ہیں:

غرورِ حُسن کا نشہ کبھی جو رخصت دے تو اپنے بے خبروں کی بھی کچھ خبر لینا

دیوانگی کے عالم میں گریباں چاک کرنے کا مضمون سبھی باندھتے ہیں مگر غربتؔ کے ہاں جیب و دامن، دونوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے:

ثابت رہا نہ عالم وحشت میں پیرہن دامن سیا جو ہم نے گریباں نکل گیا

حکمران خاندان کے ہی ایک اور چشم و چراغ صاحبزادہ اصغر علی اصغرؔ بھی رام پور کے شعرا میں اپنا منفرد مقام رکھتے تھے۔ ایک شعر دیکھیے جس میں زندگی کے سارے دُکھ محبوب کے آنے اور جانے سے جُڑے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں:

زیست تو دشوار تھی، مرنا بھی مشکل ہو گیا کہہ گئے ہیں اپنے آنے کی وہ پھر جاتے ہوئے

روہیلہ سردار محمد سربلند خاں کی اولاد میں حشمت علی خاں موجدؔ کا نام بھی رام پور کے شعرا میں شامل ہے جو مومنؔ کے مقلدین میں سے تھے۔ اُن کے ہاں سہل ممتنع کی مثال اِن دو شعروں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

کہتے ہیں:

کل تو حیلہ حنا کا ہاتھ آیا عذر آنے میں آج کیا ہو گا
ہائے تیرے مریض کا کہنا اب وہ آئیں گے بھی تو کیا ہو گا

ایک مطلع بھی دیکھیے جس میں محبوب کے تغافل کا گلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

یہاں تو جان پہ بن جائے، واں خیال نہ ہو بشر ہوں میں بھی کہاں تک مجھے ملال نہ ہو

وزیر علی خاں وزیرؔ بھی اسی قبیل کے شعرا میں سے ہیں جو مومنؔ کے اندازِ سخن سے متاثر تھے۔ وہ کہتے ہیں:

ارماں نکال لوں دلِ حسرت نصیب کے دو دِن کو دے خدا جو مقدر رقیب کا

صاحبزادہ محمد سعید خاں المؔ اور صاحبزادہ مہدی علی خاں نحیفؔ بھی نواب گھرانے کے چشم و چراغ تھے اور مشقِ سخن میں کسی سے پیچھے نہ تھے نحیفؔ کہتے ہیں:

وہ گرمیٔ نظر سے پسینے میں تر ہوئے میں غرق ہو گیا عرقِ انفعال میں

اور المؔ کا کہنا ہے کہ:

عشق بازی کے لیے چاہیے پتھر کا جگر ہم نے اس کام کو سب کاموں سے مشکل پایا

اِن شاعروں کا کلام اس بات کی دلیل ہے کہ رام پور کے حکمران خاندان میں اردو شاعری سے لگاؤ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ اِس کے ساتھ ساتھ عوامی سطح پر بھی مشاعروں کا رواج عام تھا۔ مقامی شعرا میں ایک بڑی تعداد دوسرے شہروں سے آ کر رام پور میں ملازمت کرنے والوں کی تھی مثلاً شیخ علی بخش بیمارؔ جن کی تربیت لکھنؤ میں ہوئی، رام پور آئے تو یہاں کے رنگ میں رنگے گئے۔ وہ کہتے ہیں:

کون پرساں ہے حالِ بسمل کا خلق منہ دیکھتی ہے قاتل کا

بیمارؔ اپنے محبوب کی شوخیِ ادا کو اِن لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

ہائے رے شوخی کہ آ پہنچا جو وہ گھر تک مرے پھر گیا درباں سے یہ کہہ کر کہ دھوکا ہو گیا

بیمارؔ کے ہاں داخلی جذبوں کی ترجمانی ایسے دلکش انداز میں ہوتی ہے کہ شعر پڑھتے ہوئے بے ساختہ ہمدردی ہونے لگتی ہے اور وفورِ ترحم سے قاری خود اسی کیفیت میں ڈوب جاتا ہے۔ کہتے ہیں:

رو کے ہنس پڑتا ہوں ظالم، ہنس کے رو دیتا ہوں میں
مہربانی پر تری دشمن کو خنداں دیکھ کر

زندگی کی ناکامیوں سے آخرت کے بارے میں بدگمانی پیدا ہو جانا ایک فطری سا عمل ہے۔ بیمارؔ کے اس شعر میں نامرادی کا شکوہ اس طرح ہوا ہے:

جنت میں حیاتِ ابدی خاک ملے گی دنیا میں تو مانگے نہ ملی موت خدا سے

علی بخش بیمار کے بارے میں شبیر علی خاں شکیب رقم طراز ہیں:

''بیمار کے یہاں سچی اور خالص غزل کے بے شمار نمونے ملتے ہیں۔لکھنؤ میں رہ کر بھی اُنھوں نے لکھنوی رنگِ سخن اختیار نہیں کیا بلکہ مصحفی اور میر کے نقشِ قدم پر چل کر اپنا منفرد لہجہ پیش کیا جس میں لطفِ زبان کے ساتھ غضب کا سوز و گداز ملتا ہے۔''(۲)

بیمار کے ہاں رعایتِ لفظی کا استعمال بڑے سلیقے سے ہوا ہے اس کی مثال دیکھیے:

شاید یہ روش سیکھی ہے پیچھے ترے چل کر پیچھے تو نہ چلتی تھی نسیمِ سحر ایسی

جہاں تک سوز و گداز کا تعلق ہے تو وہ کلامِ بیمار میں اس طرح رچا بسا ہے کہ رندِ بادہ خوار کی موت پر ابرِ نو بہار بھی گریہ کناں دکھائی دیتا ہے:

کون دنیا سے بادہ خوار اٹھا چشم تر ابرِ نو بہار اٹھا

رام پور کے مقامی شعرا میں نظام رام پوری کا شمار اساتذۂ سخن میں ہوتا ہے۔نظام کی شاعری میں معاملہ بندی اور محاکات نگاری کی ایسی عمدہ مثالیں ملتی ہیں کہ اردو شاعری میں شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے ہاں اِس کی نظیر مل سکے۔بقول نیاز فتح پوری:

''میاں نظام کے ہاں عنصر غالب ان اشعار کا ہے جنھیں 'ادا نگاری' اور 'معاملہ بندی' کے تحت میں داخل کر سکتے ہیں۔ادا نگاری سے میری مراد وہ اشعار ہیں جن میں معشوق کی مختلف اداؤں اور اس کی دل رُبا کیفیات کا ذکر کیا جائے مثلاً:

وہ یوں مسکرا کر نہ منہ پھیرتے نہ منظور ہوتا اگر دیکھنا

وہ چل چل کے رُکنا کسی کا غضب وہ پھر پھر کے اپنی کمر دیکھنا'' (۳)

معاملہ بندی کے ذیل میں بیان ہونے والے مضامین شوخیِ محبوب کے سبب کبھی کبھار ابتذال کی حدوں کو بھی چھو جاتے ہیں:

اس دستِ نگاریں کو ذرا میں نے چھوا تھا کس ناز سے کہنے لگے اُف، چھوڑ، گیا ہاتھ

نظام کے اصل جوہر وہاں کھلتے ہیں جہاں محاکات نگاری کا ہنر آزماتے ہیں۔یہ دو شعر تو زبان زدِ عام ہیں:

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیے، مسکرا کے ہاتھ

دینا وہ اس کا ساغرِ مے یاد ہے نظام منہ پھیر کے اُدھر کو، اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

نظام کو لکھنوی انداز بھی پسند آیا۔اُن کی شاعری میں اس کی جھلک موجود ہے بقول محبوب عالم عکس ''نظام کے دور میں رام پور کا مکتبۂ شاعری دہلی اور لکھنؤ کے رنگ میں رنگا ہوا تھا لیکن نظام نے نہ دہلی کا رنگ اپنایا اور نہ لکھنؤ کا۔مگر پھر بھی رنگ آخر رنگ ہے اچھے بھلے ثقہ پر بھی ہولی کے رنگ کی چھینٹیں پڑ ہی جاتی ہیں چنانچہ نظام بھی لکھنوی رنگ میں کچھ نہ کچھ رنگ ہی گئے۔'' (۴)

اِس رنگِ سخن کی ایک مثال درج ذیل ہے:

لپٹا کے شبِ وعدہ وہ اُس شوخ کا کہنا کچھ اور ہوس اس سے زیادہ تو نہیں ہے

نظامؔ کے عہد میں تصوف کے مضامین کم وبیش سبھی شعرا کے ہاں پائے جاتے تھے اور عام طور پر یہ شعرا فلسفۂ وحدت الوجود کے قائل تھے۔ ''سیّد نظام شاہ بھی وحدت الوجود کے قائل تھے اور کائنات کو خدا کی تجلیات کا ظہور مانتے تھے۔ آپ کا کہنا ہے کہ اپنے تشخص اور وہمِ ہستی نے ہی انسان کو خدا سے جدا اور قطرہ کو سمندر سے الگ کر دیا ورنہ حقیقت میں دونوں ایک ہیں فرماتے ہیں:

اگر خود نما وہ خود آرا نہ ہوتا یہ نیرنگِ قدرت ہویدا نہ ہوتا
تشخص ہے باعث جدائی کا ورنہ یہ قطرہ ہم آغوش دریا نہ ہوتا'' (۵)

گویا نظامؔ رام پور میں شاعری کے عہدِ دوم کے نہایت اہم شاعر تھے جن کے ہاں مضامین کا تنوع بھی ہے اور اسلوب کی سادگی اور دلکشی بھی۔ اِس دور میں دہلی اور لکھنؤ سے آنے والے نامور شعرا مثلاً داغؔ، ظہیرؔ، انورؔ، تسکینؔ، اسیرؔ، امیرؔ مینائی، تسلیمؔ، جلالؔ وغیرہم کی موجودگی سے رام پور کی بزمِ سخن میں وہ غُلغلہ ہوا کہ اِس سے یہاں کا شعری ادب دِنوں میں کچھ کا کچھ ہو گیا۔

رام پور میں آ کر بزمِ سخن کا حصّہ بننے والوں میں رحیم الدین حیاؔ دہلوی کا نام بھی شامل ہے۔ بلندیِ فکر کے ساتھ ساتھ اُن کی زبان بھی عمدہ ہے۔ کہتے ہیں:

نکلنا دل سے تمنا کا امرِ مشکل ہے یہ دم نہیں ادھر آیا ادھر روانہ ہوا

کلام میں شوخی کا عنصر بھی ہے۔ اس کی مثال دیکھیے:

جوابِ نامہ فرشتوں سے گور میں مانگا پسِ فنا بھی مرا دھیان نامہ بر میں رہا

مرزا حسین علی خاں شاداںؔ (غالبؔ کے بھتیجے) بھی دہلی سے رام پور آ کر ملازم ہوئے تھے۔ اُن کی شاعری میں غزل کا روایتی رنگ رچا بسا ہے۔ مبالغے کا مضمون اس شعر میں دیکھیے:

الٰہی نازکی بڑھ جائے اتنی کہ اُن کو ناز کرنا بھی گراں ہو

مرزا کاظم حسین حسنؔ کا تعلق بھی دلی سے تھا۔ رام پور آ کر اُن کی شاعری کا رنگ نکھرا۔ کہتے ہیں:

نہ مان کہنے کو واعظوں کے نہ ہو مسلماں حرم میں جا کر
نماز روزہ گلے پڑے گا خدا خدا کر خدا خدا کر

عشق میں بے خودی کی کیفیت بسا اوقات اِس بات سے بے نیاز کر دیتی ہے کہ محبوب وفا شعار ہے یا جفا پیشہ۔ حسنؔ کے ہاں یہ مضمون دیکھیے کس خوبصورتی سے ادا ہوا ہے:

وفورِ شوق میں کس کو خبر ہے وفا کی اُس نے یا ہم پر جفا کی

دہلی سے آنے والے شعرا کے ساتھ ساتھ لکھنؤ سے آنے والے سخن گو بھی رام پور کی بزم ادب سجانے میں پیش پیش تھے۔خواجہ ارشد علی قلق لکھنوی سے رام پور آئے تھے۔شاعری پر لکھنؤ کا رنگ غالب رہا۔تاہم انھوں نے رام پور کی معاشرت کے اثرات بھی قبول کیے اور یہاں کے رنگِ سخن میں بھی دادِ سخن دیتے رہے جس کی مثالیں اُن کے کلام میں دیکھی جا سکتی ہیں غنچے کی مسکراہٹ روایتی مضمون ہے مگر قلق نے یہ بات بڑی مہارت سے کہی ہے:

صبا نے کہہ دیا کیا کان میں کچھ یہ غنچے رہ گئے کیوں مسکرا کے

احباب کے بچھڑنے کا صدمہ لوگوں کو نڈھال کر دیتا ہے مگر قلق نے اس کیفیت کو اِس انداز سے پیش کیا ہے کہ جیسے اِن دوستوں کی جدائی کا یقین کرنا مشکل ہو رہا ہے۔وہ کہتے ہیں:

محفل میں دوستوں کی آنکھیں یہ ڈھونڈتی ہیں رونق تھی جن کے دم سے وہ لوگ اب کہاں ہیں

بڑھاپے میں جوانی گزر جانے کا احساس قدرتی طور پر ہوتا ہے مگر قلق جب بھی آئینہ دیکھتے ہیں تو یہ احساس اُنھیں شرمندہ کیے دیتا ہے:

کیوں کر کہوں شباب کا پیری میں غم نہیں محجوب کرنے کو مرے آئینہ کم نہیں

عروج لکھنوی اِس دور کے اُن شعرا میں شامل ہیں جو رام پور آ کر یہاں کے ادبی ماحول کا حصہ بن گئے اور اُن کا لکھنوی انداز زیادہ پُر لطف ہو گیا۔شعر دیکھیے:

خدا نصیب کرے زاہدوں کو جنت میں مزہ جو رات کو یارانِ انجمن میں رہا

کہیں کہیں حُسنِ ادا سے معمولی مضمون کو بلند رتبہ عطا کر دیتے ہیں:

مرنے کے لیے اُس لبِ جاں بخش سے کی راہ جینے کو تو پروائے مسیحا نہیں کرتے

زکی بلگرامی نے بھی کلب علی خاں کے عہد میں رام پور آ کر ملازمت کی۔یہاں اُن کی شاعری کے نمونے مختلف اصنافِ سخن میں سامنے آئے۔غزل کے ساتھ ساتھ قصیدہ، سلام، مرثیہ اور واسوخت بھی خوب کہتے تھے۔ غزل کے دو شعر دیکھیے:

برا ہو نامرادی کا رُلایا ہے لہو برسوں مرے دل میں رہی ہے داغ بن کر آرزو برسوں

اٹھاتی ہے کڑی کب خاطرِ نازک حسینوں کی دیا بوسہ مگر برہم رہا وہ شندخو برسوں

نارسائی کا شکوہ اور پھر محبوب کی شند خوئی کا گلہ، عاشق پر ہونے والی مہربانی پر غالب آ گیا ہے۔ لہٰذا بجائے شکر، شکایت کا مضمون زیادہ بلند آواز میں ادا ہوا ہے اور قاری کو یہ خیال بھی نہیں گزرتا کہ شاعر نے محبوب سے حظ بھی اٹھایا ہے، یہی زکی بلگرامی کی شاعری کا ہُنر ہے۔مرزا محسن علی ہندی لکھنؤ سے رام پور آنے والے اُن شعرا میں شامل ہیں جن کا لکھنوی انداز اِس ریاست میں آ کر بھی قائم رہا اور اُنھوں نے

یہاں کے رنگِ سخن کو بہت کم برتا۔شعر دیکھیے:

جب اپنی زندگی ہی تلخ گزری لبِ شیریں کو اُن کے لے کے چاٹیں

یہ لکھنوی انداز ہے جس میں لاگ اور لگاؤ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ایک اور شعر دیکھیے جس میں ناتوانی کا مضمون انوکھے انداز میں باندھا گیا ہے:

زور اپنا ناتوانی نے دکھایا اس قدر دل اٹھا سکتے نہیں ہم الفتِ معشوق سے

جان صاحب لکھنوی جو ریختی کے امام مانے جاتے ہیں، رام پور میں ملازم سرکار رہوئے۔اُن کی شاعری کا نہ رنگ بدلا نہ ڈھنگ بدلا۔ریختی گوئی میں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔دو شعر بطور مثال دیے جاتے ہیں:

نکاحی بیاہی کو چھوڑ بیٹھے ، متاعی رنڈی کو گھر میں ڈالا
بنایا صاحب امام باڑہ ، خدا کی مسجد کو تم نے ڈھا کر

یہاں زبان تھی محشر میں کچھ نہ بات ہوئی
خدا کے خوف سے بُت بن گئی نجات ہوئی

جان صاحب نے ریختی کی صنف کو رام پور کی شاعری میں شامل کیا اور مقامی لوگوں میں بہت سے اُن کے شاگرد ہوئے، اس طرح یہ صنفِ سخن سلسلہ وار رام پور کے شعری ادب کا حصّہ بنتی رہی۔جان صاحب کا مسدس بے نظیر بھی محفوظ ہے جس میں میلہ بے نظیر میں شامل ہونے والے فنکاروں کا ذکر خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔

شیخ مہدی علی ذکی نواب یوسف خاں ناظم کے عہد میں مراد آباد سے رام پور آئے اور اُن کی وفات ۱۸۶۵ء تک یہاں قیام کیا۔اُن کے کلام میں دہلی اور لکھنؤ، دونوں دبستانوں کا رنگ موجود ہے۔ لکھنوی رنگِ سخن کی مثال دیکھیے جس میں صنعتِ حُسنِ تعلیل کا استعمال بالکل انوکھے انداز میں ہوا ہے۔ کہتے ہیں:

جمالِ یار پہ ہم نے یہ ٹکٹکی باندھی کہ اپنی آنکھ کا تِل اُس کے مُنھ کا خال ہوا

ذکی کا دہلوی انداز زیادہ دلکش ہے۔اِس شعر میں اسیرِ الفتِ صیاد کی ترکیب کس خوبی سے ادا ہوئی ہے، دیکھنے کے لائق ہے:

سب ہم صفیر قید سے چھوٹے بہار میں اک میں اسیرِ الفتِ صیاد رہ گیا

صاحبزادہ اصغر علی افکار نے شاعری کا ہُنر ورثے میں پایا مگر کچھ کمال پیدا نہ کر سکے۔اُن کی شاعری میں رام پور کا مقامی رنگ دیکھا جا سکتا ہے:

دے دیا طاق سے آئینہ اٹھا کر اُن کو حال مجھ سے دلِ حیراں کا دکھایا نہ گیا

صاحبزادہ عابدؔ بھی نواب خاندان کے فرزند تھے۔ اُن کا کلام فکر اور اسلوب، دونوں اعتبار سے اپنے ہم چشموں سے بہتر ہے۔ کہتے ہیں:

نظر کعبے میں جو آیا ، اُسی کو دیر میں دیکھا عبث جھگڑا ہے اے شیخ و برہمن کفر و ایماں کا

غالبؔ کی زمین میں عابدؔ کا شعر دیکھیے جو لطف سے خالی نہیں:

ترے جھوٹے وعدے سے تھا وہ جواب صاف بہتر نہ امیدِ وصل ہوتی ، نہ یہ انتظار ہوتا

صاحبزادہ مبارک علی عاصیؔ بھی حکمران خاندان سے ہیں زبان و بیان کی صفائی اُن کی شاعری کو قابلِ مطالعہ بنا دیتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

جفا و جور میں پائی ہیں لذتیں کیا کیا تمھارے ظلم کا پوچھے کوئی مزہ مجھ سے

اِسی عہد میں آغا مرزا شاغلؔ اپنے بڑے بھائی مرزا داغؔ دہلوی کے ہمراہ رام پور چلے آئے تھے۔ داغؔ کے شاگرد تھے اور اُنھی کا انداز اپنائے ہوئے تھے۔ ایک شعر دیکھیے جس میں شاغلؔ پسِ مرگ بے سروسامانی کی حالت بیان کرتے ہیں۔

لاشے پہ دِن کو دھوپ پڑی ، شب کو چاندنی دو چادروں کا ہم کو میسّر کفن ہوا

بدن چرانے کا محاورہ شاغلؔ کے ہاں کس خوبصورتی سے آیا ہے۔ شعر دیکھیے:

نہ ہو کیوں کر گماں تم پر پرائے دل چرانے کا کہ عادت ہے تمھیں اکثر چراتے ہو بدن اپنا

نواب یوسف علی خاں ناظمؔ کے چھوٹے بھائی صاحبزادہ صفدر علی خاں صفدرؔ کا شمار رام پور کے منجھے ہوئے شعرا میں ہوتا ہے۔ اُن کے ہاں محبوب کی جدائی میں چُپ لگ جانے کا منظر دیکھیے:

کسی کی یاد نے بخشا ہے ایسا ذوقِ خاموشی کہ بُت بن کر رہے ہیں ہم خدا کے روبرو برسوں

شراب سے تائب ہو کر حسرت بھری کیفیت صفدرؔ کے شعر میں بڑے فطری انداز سے بیان ہوئی ہے کہتے ہیں:

بہارِ گل میں توبہ کر کے کس حسرت سے تکتا ہوں کبھی ساقی کے چہرے کو کبھی شیشے کی گردن کو

تاثیرِ حُسن کے بارے میں جگرؔ مرادآبادی نے کہا تھا:

حُسن مجبور نہیں عشق کا محتاج نہیں یہ جسے چاہے جہاں چاہے پریشاں کر دے

صفدرؔ کے ہاں یہ مضمون بہت پہلے بڑی خوبصورتی سے ادا ہوا ہے:

غضب کی چیز ہے یہ حُسن ، انساں لاکھ بچتا ہے مگر دل کھنچ ہی جاتا ہے ، طبیعت آ ہی جاتی ہے

ایک مثال تشبیہ کی بھی دیکھنی چاہیے:

چمک کر آسماں پر ابر میں جب چھپ گئی بجلی تمھارا جھانکنا یاد آ گیا پردے کے اوجھل سے

نواب کلب علی خاں کے عہد میں رام پور پہنچنے والے شعرا میں منیرؔ شکوہ آبادی ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ رام پور آمد کے وقت وہ ایک کہنہ مشق شاعر تھے۔لکھنوی اندازِ سخن اُن کی شاعری میں بڑی شائستگی کے ساتھ جھلکتا ہے۔مثال دیکھیے:

تمھاری زلف ورُخ کا لُطف ہم اے مہ لقا سمجھے　　اُسے بال آئینے کا اور اِس کو آئینہ سمجھے

لف ونشر مرتب کی بدولت شعر کا لُطف دوچند ہو گیا ہے۔منیرؔ کی شاعری پُر لطف ہونے کے ساتھ ساتھ معنی خیز بھی ہے:

بختِ خفتہ کا ٹھکانا کوئے جاناں میں نہ تھا　　خواب غفلت کا گزر چشمِ نگہباں میں نہ تھا
راہ و رسمِ خانہء زنجیر کس سے پوچھتے　　کوئی اگلے وقت کا دیوانہ زنداں میں نہ تھا

منیرؔ شکوہ آبادی باندہ کے نواب کو انگریزوں کے خلاف اکسانے کے الزام میں جزائر انڈیمان بھجوائے گئے۔ اس تلخ تجربے کا اظہار اُن کی شاعری میں ملتا ہے۔بقول ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری:

> ”......منیرؔ شکوہ آبادی بھی محض اپنے ذاتی غم تک محدود نہیں رہے بلکہ ہنداسلامی تہذیب کے زوال وانحطاط اور خصوصاً مسلمانوں کی حالتِ زار کا نوحہ بیان کرتے ہوئے انھوں نے گہرے عصری شعور کا ثبوت دیا ہے۔“ (۶)

منیرؔ کے ہاں اِس معاشرتی کرب کا اظہار ان شعروں میں محسوس کیا جا سکتا ہے:

مٹ گئے قصرِ معلّٰی ، کھو گئے زرّیں محل　　رنج سے معمور گر دل ہائے سوزاں ہوں تو کیا
دیکھنے والے نہیں ، پھر آئینے کس کام کے　　بے زلیخا شہر سارے یوسفستان ہوں تو کیا

فتح یاب خاں اخگرؔ رام پور کے اُن معدودے چند شعرا میں شامل ہیں جنھیں مرزا غالبؔ سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا۔اُن کے دو شعر دیکھیے:

طُرفگی حسن کی اور عشق کی نیرنگی واہ!　　دیکھے آئینہ کوئی اور ہو حیراں کوئی
عمر گو صحبتِ انساں ہی میں گزری اپنی　　پہ تماشا ہے کہ دیکھا نہیں انساں کوئی

یہ ایسا انداز ہے جسے دہلی کے رنگِ سخن سے زیادہ مناسبت ہے۔دوسرے شعر کے مصرعہء ثانی میں تماشا کی مناسبت سے ”دیکھا“ بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔رام پور کے شعرا میں حضرت مجدد الف ثانی کے خانوادے سے کچھ لوگوں کو شعر گوئی سے لگاؤ تھا۔یہ لوگ ابدالی کے حملے ۱۷۶۲ء کے وقت سرہند سے رام پور چلے آئے تھے۔حبیبؔ مجددی اِسی گھرانے کے فرد تھے۔دیوانگی کے سبب گھر سے نکل کھڑے ہونا ایک مروّجہ مضمون ہے۔حبیبؔ نے یہ بات کچھ اِس طرح کہی ہے:

جوشِ وحشت سے وصال اپنے مقدر میں نہیں　　کہ وہ مہماں ہے اگر گھر میں،تو ہم گھر میں نہیں

اور پھر اپنی تنہائی کی کیفیت محبوب کے گوش گزار کرنے کا انداز دیکھیے:

بے حجابانہ چلے آؤ عیادت کو مری کہ شبِ غم کے سوا کوئی مرے گھر میں نہیں

یہ شعر فارسی کے کسی قدیم استاد کے اس شعر سے توارد معلوم ہوتا ہے:

بے حجابانہ درا از درِ کاشانۂ ما کہ کسے نیست بجز دردِ تو در خانۂ ما

عمرؔ مجددی کا تعلق بھی مجدد الف ثانی کے خاندان سے تھا۔ اُن کے قطعہ بند شعر دیکھیے جن میں شاعر اپنی ناتوانی کو دیدارِ محبوب کے لیے حیلے کے طور پر استعمال کرتا ہے:

زردیِ رُخ مری الفت کی خبر دیتی ہے بن کے غماز یہ رسوا مجھے کر دیتی ہے

اب بھی گھبرا کے الٹ دیتے ہیں اکثر وہ نقاب ناتوانی میں بھی آہ اتنا اثر دیتی ہے

عاشق کا نحیف ونزار ہونا ایک پیش پا افتادہ مضمون ہے لیکن عمرؔ کے ہاں یہ کیفیت بڑے پُر لطف انداز میں بیان کی گئی ہے۔ تاہم دوسرے شعر میں عروضی سقم پایا جاتا ہے۔ اس کے مصرعۂ ثانی میں لفظ آہ، پورا ادا نہیں ہوتا۔

حسن علی عاجزؔ کا شمار بھی رام پور کے اُن شعرا میں ہوتا ہے جو مروّجہ رنگ میں شعری ادب تخلیق کر رہے تھے۔ اُن کا ایک شعر دیکھیے جس میں محبوب کا تصور دل و دماغ پر اس طرح چھایا ہوا ہے کہ شورِ حشر سے کم کوئی ہنگامہ اُنھیں متوجہ نہیں کر سکا:

کیوں شورِ حشر نے ہمیں ہشیار کر دیا بے خود پڑے ہوئے تھے کسی کے خیال میں

شاہ عبدالرزاق فقیرؔ اس عہد کے پُر گو شاعر تھے۔ افسوس کہ اُن کا کلام محفوظ نہ رہ سکا۔ دو شعر مثال کے طور پر لکھتا ہوں:

وہ جو پہلو سے اٹھے درد کچھ ایسا اٹھا تھام کر دل کو کئی بار میں بیٹھا اٹھا

لفظوں کی نشست و برخاست اِس شعر کی کیفیات کے ساتھ ایسے ہم آہنگ ہو گئی ہے کہ مبتلاے درد کا بے چین ہو جانا آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے دوسرا شعر دیکھیے جس میں لفظوں کے انتخاب اور لفظ 'دیکھے' کی تکرار نے لطف دوبالا کر دیا ہے:

نا امیدی ہے برستی گلِ تربت پہ مری دیکھے وہ جس نے نہ دیکھے ہوں کبھی یاس کے پھول

حکیم احسنؔ بھی رام پور کے اُن شعرا میں ہیں جنھیں غالبؔ سے تلمذ کا شرف حاصل رہا ہے۔ اُن کا شعر دیکھیے جس میں صنعتِ تضاد سے محبوب کے رُخ پر بکھری ہوئی زلفوں کا منظر اجاگر کیا گیا ہے:

خدا کے واسطے گیسو ہٹا دے اپنے چہرے سے ارے ظالم نہ کر رتبہ برابر کفر و ایماں کا

محبوب کی جفا پر خفیف سا طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

نا مہربانیوں پہ تو مرتا ہے اک جہاں کہیے کہ کیا غضب ہو اگر مہرباں ہوں آپ

مظفر خاں گرمؔ پُر گو شاعر تھے۔ اُن کا کلام مخطوطات کی صورت میں رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ اُن کا شعر دیکھیے:

مر جائیں روزِ ہجر، شبِ وصل جی اٹھیں گر موت و زندگی پہ خدا اختیار دے

محمد حسن عسکری لکھتے ہیں:

> ''محبوب یا زندگی کی شکایت، گلے، شکوے، طعنے، اپنے آپ کو بہتر یا برتر یا حق پر یا مظلوم سمجھ کر، اپنے آپ کو دوسرے انسانوں سے، محبوب سے، زندگی سے، کائنات سے الگ کر کے کوئی کڑوی، کسیلی یا دل میں چبھنے والی بات کہنا یا جلی کٹی سنانا، یا دل کے پھپھولے پھوڑنا، یہاں اختصار اس لیے برتا جاتا ہے کہ چوٹ کراری پڑے..... چنانچہ واسوخت والی ذہنیت کو بھی چھوٹی بحر راس آتی ہے۔'' (۷)

گرمؔ کے ہاں بھی چھوٹی بحر کی غزلوں میں یہ تمام عناصر بدرجہءاتم موجود ہیں۔ مثال کے طور پر یہ دو شعر دیکھیے:

مہربانی میں دل ستانی ہے قہر کرتے تو کیا ٹھکانہ تھا

تجھ پہ ہنستا ہے چاکِ جیب مرا شرم اے بخیہ گر نہیں آتی

رام پور کے شعرا میں جارج فانتوم جرجیسؔ وصاحبؔ کا نام بھی آتا ہے۔ اُن کا شعر دیکھیے:

یہ آرزو ہے ترے آنے کی مجھے اے شوخ کہ جھوٹے وعدوں پہ بھی انتظار باقی ہے

مذکورہ بالا تمام شعرا کی خدمات ایک زمانے تک اہلِ ذوق کی نظروں سے اوجھل رہیں۔ اس کا ایک سبب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ رام پور کی چھوٹی سی ریاست میں اشاعت کتب کا انتظام نہ تھا۔ دوسرا سبب شبیر علی خاں شکیبؔ کے بقول یہ تھا کہ ''ہر دیسی ریاست کے باشندوں کی طرح اہلِ رام پور بھی اس ریاست کو کسی ملک سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ کسی شاعر کا رام پور کے ماحولِ شعر و سخن میں مقبول ہو جانا کافی تھا۔'' (۸)

۱۸۵۷ء کے بعد جو محفلِ شعر و ادب رام پور کی زینت بنی اُس کے بارے میں یہ غلط فہمی عام ہے کہ داغؔ اور امیرؔ کی شاعری نے نہ صرف اس محفل کو رونق بخشی بلکہ دبستانِ رام پور کی بنیاد بھی انھی اساتذۂ فن نے رکھی۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۸ء میں داغؔ جب رام پور آئے تو محض ۲۶ برس کے تھے اور گلزارِ داغؔ کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کر پائے تھے۔ اِس مجموعے میں بھی رام پور آ کر متعدد تبدیلیاں کیں،

آفتابِ داغؔ اور مہتابِ داغؔ اُن کے قیامِ رام پور کی یادگار ہیں۔جن کا رنگِ سخن گلزارِ داغؔ میں شامل شاعری سے جداگانہ ہے۔

اِس میں کلام نہیں کہ لکھنوی شعرا، اسیر، جلال، امیر مینائی وغیرہم کے مقابلے میں منفرد زبان وبیان اور شوخیٔ مضامین کی بدولت داغؔ کو بہت جلد شہرت نصیب ہوئی تاہم استادی کا مرتبہ اُنھیں رام پور میں رہ کر مسلسل مشقِ سخن کے نتیجے میں ملا۔ بقول تمکین کاظمی:

''رام پور پہنچ کر داغؔ بھی اِس کانِ نمک میں گھُل مل گئے،اور جو کسر ایک آدھ آنچ کی رہ گئی تھی وہ بھی پوری ہو گئی۔ (۹)

امیرؔ مینائی،نواب یوسف علی خاں ناظمؔ کے عہد میں رام پور پہنچے تو اُن کی عمر ۳۰ برس تھی۔اِس سے پہلے قیام لکھنؤ کی شاعری کے ضمن میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی فرماتے ہیں:

''اِس زمانے کی شاعری کا اندازہ بعض غزلوں سے ہوسکتا ہے مثلاً یہ غزل اسی عہد کی ہے:

ہم ہوں یا موسیٰ ہو کوئی دیکھ سکتا ہے اسے　　پردے حیرت کے پڑے ہیں جلوہ گاہِ طور میں

حوصلہ عالی اگر ہو ہر جگہ معراج ہے　　دار بھی ہے شاخِ سدرہ دیدۂ منصور میں

.....اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری میں اس وقت تک نہ کوئی خاص رنگ پیدا ہوا تھا اور نہ طبیعت کا اصلی زور ظاہر ہونے پایا تھا۔'' (۱۰)

امیرؔ مینائی لکھنؤ سے نکل کر کاکوری گئے تھے وہاں محسن کاکوروی کی صحبت میں نعت گوئی کی طرف راغب ہوئے۔اِس کے بعد رام پور آکر اُن کی شاعری میں روز افزوں ترقی ہوئی۔رام پور میں امیرؔ مینائی کی آمد نہ صرف اُن کے لیے بلکہ اردو شاعری کے لیے بھی خوش بختی کی علامت تھی۔

ابواللیث صدیقی بجا طور پر رقمطراز ہیں:

''رام پور کی ملازمت نہ صرف امیر مینائی بلکہ عام لکھنوی شاعری کی تاریخ میں نہایت اہم زمانہ ہے۔دہلی اور لکھنؤ کی ویرانی کے بعد یہی ایک دربار ایسا تھا جہاں ہر فن کے کامل اور امام موجود تھے۔یہ پہلا موقع تھا کہ دہلی اور لکھنؤ کے شعرا کو ایک ہی محفل میں دادِ سخن وری دینا پڑی،قدرتی طور پر ایک نے دوسرے سے فائدہ اٹھایا۔'' (۱۱)

امیرؔ مینائی ۱۸۸۵ء میں لکھنؤ واپس گئے تو اُن کی شاعری میں تھوڑا سا تغیر رونما ہوا جس کا اظہار اُنھوں نے صنم خانۂ عشق میں اس طرح کیا ہے:

پچھلا کلام بھی ہے جو اس میں شریک امیرؔ　　دیواں میں اس کا رنگ کہیں ہے کہیں نہیں

امیرؔ مینائی جلد ہی دوبارہ رام پور طلب کیے گئے لیکن اُن کی قدر و منزلت وہ نہ رہی تھی جو نواب

کلب علی خاں کے عہد تک تھی۔ داغؔ بھی آخر میں دکن چلے گئے۔ مگر اِن دو بڑے شاعروں کے درمیان مسابقت کے جذبے نے رام پور میں اردو شاعری کے فروغ کے لیے وہ کام کیا جو بادِ صبا گلوں کی پرورش کے لیے کرتی ہے۔

جلالؔ لکھنوی کا کلام بھی اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ رام پور آنے والے شعرا نے یہاں کے رنگِ سخن کو اختیار کیا۔ جلال کا پہلا دیوان روایتی انداز میں اور دوسرا رام پور کے شعری ذوق کے مطابق ہے۔ یہی سبب ہے کہ رام پور کی اردو شاعری کا دوسرا دور (۱۸۵۷ء تا ۱۸۹۰) ایسے شعری سرمائے کا امین ہے جس میں دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کے ساتھ ساتھ رام پور کا مقامی رنگِ سخن بھی واضح طور پر جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) شبیر علی خاں شکیبؔ۔ رام پور کا دبستانِ شاعری، ص ۲۷۹

(۲) شبیر علی خاں شکیبؔ۔ رام پور کا دبستانِ شاعری، ص ۳۰۸

(۳) نیاز فتح پوری۔ ''میاں نظام رام پوری'' مشمولہ نظام رام پوری، حیات اور شاعری، ڈاکٹر شعائر اللہ خاں، مرتب؛ (رام پور: مکتبہ وزیریہ، ۱۹۹۸ء) ص ۲۶

(۴) محبوب عالم عکسؔ۔ ''نظام رام پوری اور اُن کا رنگِ تغزل'' مشمولہ نظام رام پوری، حیات اور شاعری، ص ۱۷۰

(۵) عبدالہادی خاں کاوشؔ۔ ''سید نظام شاہ نظامؔ اور تصوف'' مشمولہ نظام رام پوری، حیات اور شاعری، ص ۱۹۹

(۶) محمد فخر الحق نوری، ڈاکٹر۔ آزادی کی گونج (لاہور: پولیمر پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء) ص ۲۱

(۷) محمد حسن عسکری۔ مجموعہ (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء) ص ۳۳۳

(۸) شبیر علی خاں شکیبؔ۔ رام پور کا دبستانِ شاعری، ص ۳۱

(۹) تمکین کاظمی۔ داغ (لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۶۰ء) ص ۷۷

(۱۰) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری (کراچی: غضنفر اکیڈمی پاکستان، ۱۹۸۷ء) ص ۶۴۲

(۱۱) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری، ص ۶۴۳

✿✿✿